آہ! ابوالکلام

ایک تاثر

از

(جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی دہلی یونیورسٹی دہلی)

آج اگر قلم میں روانی ہوتی تو رگِ سنگ سے لہو ٹپکنے لگتا۔

اگر فصاحت و بلاغت یوں بے جان و بے روح نہ ہوتیں تو پتھر کے دل پگھل جاتے۔

اگر خطابت یوں خاموش اور مہر بہ لب نہ ہوتی تو آسمان خون کے آنسو رونے لگتا۔

لیکن ——

آج قلم خود نوحہ کناں ہے کہ صاحبِ قلم نہ رہا۔

فصاحت و بلاغت خاک بسر ہیں کہ کوئی ان کا اداشناس نہیں رہا۔

خطابت غمگین ہے کہ اس کا کوئی رمز شناس باقی نہیں۔

—— مولانا ابوالکلام آزاد ایک نادرہ کار صاحبِ قلم، ایک فصیح و بلیغ مقرر، ایک جادو بیان اور آتش نوا خطیب ہی نہیں، آزادی کے مجاہد اور نئے ہندوستان کے معمار بھی تھے۔ وہ اس صحیفہ کا آخری ورق تھے جس کی تزئین و آرائش میں علم و فضل کی بہترین روایات شامل تھیں۔ وہ ہندی اسلامی تمدن کی مایہ ناز پیداوار اور اس علم و فکر کا کامل نمونہ تھے جس کی مثال حضرت شاہ ولی اللہ کے بعد ملنا ممکن نہیں۔ لیکن ان کی غیور طبیعت کو یہ ہرگز گوارا نہ تھا کہ حال کو "بلا معاوضہ" ماضی کے قرض سے گراں بار کر دیا جائے اس لئے ان کا گوشۂ چشم ہمیشہ مستقبل کی طرف رہا۔ ان کے خطبات اور الہلال اور البلاغ کی تحریروں اور کانگریس کی رودادوں کو پڑھئے اور ۱۹۴۷ اور ۱۹۴۸ کے واقعات پر غور کیجئے حیرت ہوتی ہے کہ ان کی نظر تاریکی

کے کتنے پردوں کو نعوذ کر سکتی تھی۔

گاندھی جی کے نورتنوں میں مولانا آزاد غیر معمولی اہمیت کے حامل تھے۔ ان کی ۶۹ برس کی زندگی میں آزادی کی جدوجہد اور اس کی بہت سی منزلیں سمو گئی تھیں اس لئے ان کی صدارت و قیادت ہماری تاریخ کا سب سے اہم باب ہے۔ آزادی سے پہلے اور اس کے بعد بھی وزیر معارف اور کانگریس کے رکن رکین کی حیثیت سے کون سا فیصلہ ہے جس پر ان کا اپنا نقش نہیں۔ یہ سب کام صرف قدیم تمدن کی گہرائی یا پختگی کی بدولت ممکن نہیں۔ جب تک اس میں جدید کی بیداری اور اس کا احساس و شعور شامل نہ ہو۔

زندگی بسر کرنے کے لئے ایک اعلیٰ اور شورش انگیز مقصد کا ہونا ضروری ہے۔ حضرت مولانا نے اپنے مقصد اور منزل و محمل کا انتخاب خوب سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ اور جب فیصلہ کر لیا تو اس پر سختی کے ساتھ جم گئے یہاں تک کہ پہاڑ ہل گئے لیکن وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ ان کا مقصد بلند تھا اس لئے ان کی وفا کا درجہ بھی بلند تھا۔ اور وفاداری بھی ایسی وفاداری جسے قبلہ نما کی سوئی قبلہ کی سمت کرتی ہے۔ اس راستہ میں کیا کیا دقتیں پیش آئیں، کیسی کیسی سختیاں جھیلیں، کس کس طرح کی ذلتیں اٹھائیں ـــــ ان مخلصانہ قربانیوں کی داستان ہماری نئی نسل کو جو چھپی روایات اور تاریخ سے بے بہرہ ہوتی جاتی ہے، ایمان اور یقین کی ایک نئی دولت بہم پہنچا سکتی ہے۔ مسلم لیگ والوں نے کون سا الزام ہے جو ان کو نہیں دیا کون سی ناملائم بات ہے جو ان کے خلاف نہیں کہی لیکن وہ ان سب چیزوں کو دریائے بے تابی کی ایک موجِ خون سمجھ کر برداشت کرتے رہے اور تحریر و تقریر دونوں میں ہمیشہ ان کا رد یہی رہا کہ

آنچہ در گفتار فخر تست آں ننگِ من است

قطرہ کو گہر بننے تک بہت سی منزلیں طے کرنا پڑتی ہیں لیکن موتی بننے کے بعد وہ بے پناہ ہو جاتا ہے اس کو کوئی خطرہ نہیں رہتا ہے دریا کا طوفان اسے منتشر نہیں کر سکتا۔ اس سے برابر نور کی لہریں نکلتی رہتی ہیں۔ مولانا کی زندگی اس "پرافشانی نور" کی بہترین مثال ہے لیکن

گوہر کو جامد سمجھنا صحیح نہیں - مولانا مرحوم نے یہ نور افشانی حکمت اور بصیرت سے کی ہے جس کا ان کو بڑا حصہ ملا تھا۔ ان کی زندگی میں نئے تقاضوں کا احترام، اور مستقبل کی نبض شناسی موجود تھی - آزادی کے بعد جس تفکر و تدبر، جس دیدہ وری اور تعمیری صلاحیت کی ضرورت ہوتی ہے وہ ان میں بدرجہ اتم موجود تھی اور اس کی جھلک ان تمام نقشوں میں نظر آتی ہے جو انھوں نے ۱۹۴۷ء کے بعد خوب سے خوب تر کے اصول پر بنائے تھے - یہی حال ان کی تحریروں کا ہے جن میں زمانہ کی نبض چلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے - ان کی ابتدائی نثر میں اس دور کی سیاست کے تمام تیور موجود ہیں - فقروں میں مسلح اور خوش ترتیب فوج کا سا جلال اور شکوہ ہے - الفاظ میں نقارہ و دھل کا سا شور اور ہنگامہ ہے - جملوں میں آتش خانوں کی سی گرمی ہے جس نے مصلحتوں کی برف کو پگھلا دیا اور محاربی فطرت میں آگ سی لگا دی - لیکن یہ شان دار اور پر شکوہ نثر الہلال اور البلاغ تک رہی - غبار خاطر اور کاروانِ خیال کا اسلوب دوسرے موثرات خارجی کا نتیجہ ہے اسی لئے اس میں ادب اور لطافت کی جو گلکاریاں ہیں وہ سب سے الگ ہیں - ترجمان القرآن کے مقدمہ میں جو سادگی اور پرکاری ہے اس کا اردو میں جواب نہیں - یہ معلوم ہوتا ہے کوثر و سلسبیل کی موجیں ہیں جو بہ نکلی ہیں -

حضرت مولانا رندگی کو ایک فریضہ سمجھتے تھے جسے انجام دینا چاہیئے ایک بوجھ جسے خندہ پیشانی سے اٹھانا چاہیئے - ان کا خیال تھا کہ خوش رہنا محض ایک طبعی احتیاج ہی نہیں بلکہ ایک اخلاقی ذمہ داری بھی ہے -

حضرت مولانا "باغ وجود" کے "ثمر پیش رس" تھے اور ان کی "نمود" میں ایک طرح کی "غرابت" تھی یعنی وہ لوحِ جہاں پر حرف مکرر نہیں تھے - اور ظاہر ہے کہ یہ جنس ارزاں نہیں ہو سکتی - مذہب میں، ادب میں، سیاست میں، معاشرت میں، فکر و نظر کی عام راہوں میں وہ کبھی وقت کے معمولی قافلوں کا ساتھ نہ دے سکے - ان کی نظر کا پیمانہ ہر جگہ بلند اور نظر کا معیار ہر جگہ ارجمند تھا -

مولانا نئی ہندوستانی تہذیب کا محل، انسانیت اور رواداری کے وسیع تصور پر قایم کرنا چاہتے تھے اور انھوں نے اس کی بنیادوں کو سلامت روی، بے لاگ صداقت، خدا پر بھروسہ اور حق کی فتح کے یقین سے بھرا تھا۔ ان کی شخصیت میں ایسا حسن تناسب اور ایسی دل کش ہمواری تھی کہ وہ ہر مشکل مسئلہ کو طے کر سکتے تھے۔ اور ان کا ناخن تدبیر ہر گتھی کو با آسانی سلجھا سکتا تھا۔ کتنا ہی ٹیڑھا اور الجھا ہوا معاملہ کیوں نہ ہو، تھوڑی سی گفتگو کے بعد حقیقت حال ان کی گرفت میں آجاتی تھی اور جب وہ نکتہ کو پکڑ لیتے تھے تو پھر اس کو چھوڑتے نہ تھے۔ معاملہ کو صحیح نظر سے دیکھنا اور اس کو اس طرح پیش کرنا کہ بات ذہن نشین اور خاطر نشان ہو جائے معمولی سعادت نہیں ہے۔

ہندوستانی تہذیب کی بنیادی خصوصیتیں انسانیت اور رواداری ہیں۔ مولانا میں یہ خوبیاں صفت کے طور پر نہیں آئی تھیں ان کی ذات کا جزو تھیں۔ انھوں نے اسلام سے اور ہندوستانی تہذیب سے وہ سب کچھ لیا تھا جو انھیں لینا چاہئے تھا۔ اس لئے ان کے تخیلات کی جڑیں دور تک چلی گئی تھیں۔ اور اس لئے اس ورثہ کی جھلک ان کی زندگی کے ہر شعبہ میں نظر آتی ہے لیکن ان کی یہ بڑائی ہے کہ ان کا تعلق صرف ماضی ہی سے نہیں، حال اور مستقبل دونوں سے ہے اس لئے ان کے کارنامے زندہ رہیں گے اور ان کے کارناموں کی پرچھائیاں نئے ہندوستان میں حرکت کرتی ہوئی نظر آئیں گی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما!

خلافت راشدہ

حصہ دوم تاریخ ملت:- عہد خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے واقعات قدیم و جدید عربی تاریخوں کی بنیاد پر صحت و جامعیت کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں، یہ کتاب کالجوں اور اسکولوں کے کورس میں داخل ہونے کے لائق ہے۔ جدید ایڈیشن، صفحات ۳۷۶ قیمت ہے مجلد ۳/۱۲ ۔